تعارفِ کُتب

حلال و حرام | از عطاء اللہ پالوی صاحب قیمت دو روپے چار آنے ضخامت ۲۸۸ صفحات اخباری کاغذ پر مکتبۂ جدید، لاہور نے شائع کی ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ ہے۔

اس ملک کے اندر مغربی افکار و نظریات کو "مشرف بہ اسلام" کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے باہر سے بھی برابر کمک پہنچ رہی ہے۔ چنانچہ دنیا کے کسی خطے میں جب کوئی "صاحبِ نظر" اس کام کے لیے کارآمد دکھائی دیتے ہیں تو ان کی "خدماتِ جلیلہ" سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ زیرِ تبصرہ تصنیف بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے فاضل مصنف ہندوستان میں تشریف فرما ہیں لیکن اُن کے خیالات کی اشاعت پاکستان میں ہو رہی ہے۔

کتاب کا انداز تجدد پسندوں کے عام طرزِ فکر سے ملتا جلتا ہے یعنی یورپ میں فنونِ لطیفہ کو فروغ حاصل ہو رہا ہے اور کُتا ان کے ہاں محبوب و محمود ہے لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے مغرب کی پیروی نہیں کی اس لیے وہ فنونِ لطیفہ سے بھی ناواقف رہے اور کُتا بھی اُن کا منظورِ نظر نہ بن سکا۔ ہماری اس "پس ماندگی" کے اسباب بھی پالوی صاحب نے وہی بیان کیے جو تجدد پسند عام طور پر بیان کرتے ہیں یعنی مسلمانوں نے قرآن سے رہنمائی حاصل نہیں کی جو فنونِ لطیفہ کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ساتھ کُتے کی عظمت کا بھی معترف ہے اور انہوں نے حلت و حُرمت جاننے کے لیے حدیث کی روایتوں پر اعتماد کیا، نتیجہ وہی روایتیں جو کُتے کو ناپاک اور مجسمہ سازی کو حرام قرار دیتی تھیں، مسلمانوں پر حاوی ہو گئیں۔

مؤلف نے از راہِ کرم اپنی وسعتِ قلبی سے کام لیتے ہوئے اس سلسلہ میں چند احادیث بھی نقل کی ہیں اور پھر انہیں عجمی سازش قرار دیتے ہوئے بزعمِ خود ان کا پردہ بھی چاک کیا ہے اس سلسلہ

میں کتے کی "بزرگی اور برتری" ثابت کرنے کے لیے جو واقعاتی اور تجرباتی مواد جمع کیا گیا ہے وہ چونکہ غیر قرآنی ہے اس لیے ہم اُس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے پالوی صاحب کی صرف قرآن فہمی کے چند نوادر پیش کرتے ہیں۔

پالوی صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن میں کتے کا ذکر متعدد جگہ آیا ہے مثلاً اصحابِ کہف کے کتے کا ذکر ہے، شکاری کتوں کا ذکر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن میں اہلِ کتاب کے نالائق اور گمراہ افراد کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ان کی مثال کتے کی ہے کہ اگر اسے کھدیڑو تو بھی ہانپے اور یونہی چھوڑ دو تو بھی ہانپے۔ یہ آخری دلیل جو فاضل مصنف نے کتے کی "عظمت" کے لیے پیش کی ہے، ان کے طرزِ استدلال کا شاہکار ہے۔ جو عقل قرآنِ حکیم کے اس ارشاد سے کتے کے عزّ و شرف کا پہلو نکالتی ہے اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ اسے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انسانی فکر جب ایک مرتبہ بے لگام ہو جائے، پھر وہ گمراہی کی کن کن خطرناک وادیوں میں بھٹکتی پھرتی ہے۔

باقی رہا اصحابِ کہف کا کتا تو اس ایک کتے کی وجہ سے کتوں کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو جملہ ممکن اوصافِ حمیدہ سے متصف تسلیم کر لینے کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ وہ ایک محافظ اور چوکیدار کتا تھا جس کا نقشہ قرآن نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ وہ اپنے دونوں بازو غار کے دہانے پر پھیلائے بیٹھا ہے، اس کتے کے رکھنے کی اجازت حدیث میں بھی آئی ہے آخر اس پر ان کتوں کو کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے جو شوقیہ پالے جاتے ہیں اور جو پہریدار کی حیثیت میں نہیں رہتے بلکہ لختِ جگر کی طرح صاحب بہادر اور میم صاحبہ کی آغوش میں براجمان ہوتے ہیں۔
شکاری کتے کا معاملہ بھی چوکیدار کتے کا سا ہے۔ اس کا پالنا بھی ایک حقیقی ضرورت کے تحت آتا ہے اور اس کے رکھنے کا جواز بھی حدیث سے ثابت ہے۔ کوئی مسلمان اس کے عدمِ جواز کا قائل نہیں، سوال یہ ہے کہ ان دو قسم کے کتوں کے سوا اور کس قسم کے کتے کو رکھنے کا جواز پالوی صاحب کو قرآن میں ملا ہے، جسے پیش کر کے وہ حدیث کا معارضہ کر سکتے ہوں۔

پالوی صاحب نے سورۂ مائدہ کی ایک متعلق آیت کا ترجمہ بھی غلط کیا ہے۔ انہوں نے وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ کا ترجمہ "تم نے جن کتوں کو سدھایا" کیا ہے حالانکہ جوارح سے مراد سارے شکاری جانور ہیں اور مکلّبین سے مراد سدھانے والے انسان ہیں یا پھر زخمی کرنے والے (یعنی شکاری) جانور ہی مراد ہیں، بہرحال یہ آیت پالوی صاحب کے نزدیک اگر کسی عزو شرف کی موجب ہے تو پھر اس میں دوسرے شکاری درندوں اور پرندوں کو بھی حصّہ ملنا چاہیے۔ تنہا کتا ہی ساری عزت کا اجارہ دار نہیں ہے

اسی طرح انہوں نے لفظ "انعام" کے سمجھنے میں بھی سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ ان کی نظر میں سارے جانور انعام ہیں جن میں کتّے کو نمایاں ترین مقام حاصل ہے۔ انعام کے اس مفہوم کا تصور وہی شخص کر سکتا ہے جو پالوی صاحب کی طرح قرآن اور لغتِ عرب دونوں سے ناواقف ہو۔ عربی کی معمولی شُدبُد رکھنے والا آدمی بھی یہ جانتا ہے کہ لفظ انعام عربی میں اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری کے لیے بولا جاتا ہے قرآن خود سورۂ انعام میں اس معنی کی صراحت کرتا ہے۔ اردو میں مویشی کا لفظ قریب قریب اس کا ہم معنی ہے۔ بہیمہ کا لفظ اس سے وسیع تر ہے، لیکن اس کا اطلاق بھی ہر جانور پر نہیں بلکہ چرنے والے چوپائے پر ہوتا ہے۔ درندوں کے لیے ان دونوں لفظوں سے الگ سبع کا لفظ مستعمل ہے۔ سورۂ مائدہ کے آغاز میں جہاں یہ فرمایا ہے اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ، تو اس سے مراد یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشی کی قسم کے چرند حلال کیے گئے۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے حلّت کے دائرہ کو وسیع تر کر دیا ہے، اس میں وہ سارے چرنے والے چوپائے داخل ہو گئے جو فی الجملہ انعام سے ملتے جلتے ہوں لیکن سخت حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ حلّت کے جس دائرے کی وسعت کو اللہ تعالیٰ نے صرف مویشی یا اسی نوعیت کے چرندوں تک محدود کیا تھا اس دائرے کو اب عطاء اللہ پالوی جیسے حضرات سارے جانوروں پر محیط کر رہے ہیں اور ان کے پیش کردہ دائرہ حلّت میں کتّے، بلّیاں، گیدڑ، بھیڑیے اور شیر سب آجاتے ہیں۔

پالوی صاحب کو اپنی تحقیقِ انیق کے پورے مضمرات سمجھنے میں بھی غلطی لگی ہے۔ اگر انعام کا مطلب اور مفہوم وہی ہے جو وہ بیان فرما رہے ہیں تو پھر انہوں نے خواہ مخواہ اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کی۔ اس کی رو سے کتا تو کیا ہر جانور کو حلال کرنے کے لیے اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ کے الفاظ کافی ہیں۔ معلوم نہیں وہ کس

ترنگ میں آکر اپنے اس قرآنی استدلال کو نظر انداز کر گئے۔

پالوی صاحب نے ص۴۹ میں ایک اور بھی عجیب و غریب نکتہ پیدا کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"یاد رکھیے کتّے کو اللہ تعالیٰ نے یونہی فضول، بیکار اور لایعنی پیدا نہیں کیا۔ قرآن میں ہے مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ (آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے ہم نے اُسے بلا مصلحت پیدا نہیں کیا ہے)۔"

فاضل مصنف اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ کتا چونکہ آسمان و زمین کے درمیان ہے اس لیے اس کی پیدائش سراسر حق اور مبنی بر مصلحت ہے اور اس وجہ سے وہ ناپاک نہیں بلکہ حلال و طیب ہے۔ اگر کتا محض آسمان و زمین کے درمیان ہونے کی وجہ سے پاک ہو سکتا ہے اور انسانی محبت کا استحقاق رکھتا ہے تو پھر خنزیر بھی اسی زمرہ میں شامل ہونے کی بنا پر اسی عزّ و شرف کا مستحق ہے جو کتّے کو دیا جا رہا ہے کیونکہ وہ بھی تو آخر اللہ ہی کی مخلوق ہے اور اسکی پیدائش بھی سراسر حق پر مبنی ہے۔ اگر پالوی صاحب کی اس نکتہ آفرینی کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر خود اللہ میاں کے کاموں میں انسان کو تضاد محسوس ہونے لگتا ہے، خالقِ کائنات ایک طرف تو خنزیر کو زمین و آسمان کے درمیان پیدا کر کے اس کی پیدائش کو سراسر حق اور مبنی بر مصلحت ٹھہراتا ہے مگر دوسری طرف اسے حرام قرار دیتا ہے۔ یہ اچھا ہوا کہ پالوی صاحب نے اپنی اس نکتہ آفرینی سے قرآن مجید کے اس تضاد کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ اس طرح آہستہ آہستہ حدیث کے بعد قرآن سے بھی مسلمانوں کا پیچھا چھوٹ جائیگا اور مغربی تہذیب کے سیلاب میں وہ زیادہ اطمینانِ قلب کے ساتھ بہ سکیں گے۔

یہ ہے اس فکر و بصیرت کا ایک نادر نمونہ جو خالص قرآن کے "غیر متبدل اصولوں" سے فیض یاب ہونے اور عجمی روایات کی بندشوں سے آزاد اور فقہاء کی نکتہ آفرینیوں سے بے نیاز ہو کر پیدا ہوتی ہے کتّے کی اس بحث کے بعد پالوی صاحب نے فنونِ لطیفہ کی طرف اپنے رہوارِ فکر کا رُخ پھیرا ہے اور فرماتے ہیں:-

"یہ ناممکن ہے کہ قرآن اور محمد کا مسلک فنونِ لطیفہ کے بارے میں وہی ہو جو کسی ناواقفِ فطرتِ انسانی کا ہو سکتا ہے اس لیے ایک لمحے کو بھی وہم و گمان میں یہ بات نہیں لائی جا سکتی کہ اسلام اور اسکے دستور العمل قرآن اور اس کے لانے والے برگزیدہ انسان محمد رسول اللہ نے مسلمانوں کے لیے

مصوری، موسیقی، مجسمہ سازی اور شاعری وغیرہ کو حرام یا ممنوع قرار دیا ہو۔"

اگر اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آرٹ انسان کی ایک فطری امنگ ہے جس سے کوئی فرد بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ہم لازمی طور پر آرٹ کے انہی مظاہر کو اپنائیں جو ہمیں مادہ پرستانہ تہذیب نے دیئے ہیں اور انہیں قرآن مجید سے کسی نہ کسی طرح جائز ٹھہرانے کی کوشش کریں۔ پھر ہمیں ان کی یہ بات بھی عقل و فکر کے بالکل منافی معلوم ہوتی ہے کہ "مجسّمے کا تعلق محض فن سے ہے عقیدے سے نہیں۔ اور دنیا میں ہر جگہ مجسّمے فنی حیثیت ہی سے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی پرستش نہیں ہوا کرتی، پرستش کا تعلق تو دل اور دماغ سے ہے۔" اگر پرستش کا تعلق دل و دماغ سے ہے تو پالوی صاحب براہِ کرم یہ بتائیں کہ فن کا تعلق ہماری زندگی کے کس حصے سے ہے۔ ہم تو آج تک یہی سمجھتے چلے آئے ہیں کہ فن کا ذوق و وجدان نہایت گہرا رشتہ ہے اور یہ ذوق و وجدان دل و دماغ کے اندر ہی پرورش پاتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ پالوی صاحب اگر یہ ثابت کر دیں کہ فن کا دل و دماغ سے رابطہ نہیں بلکہ جسم کے کسی اور حصے سے تعلق ہے تو ان کی یہ تحقیق بڑی ہی لاجواب ہو گی اور پوری دنیا سے دادِ تحسین وصول کرے گی۔

پالوی صاحب نے خیر و شر کے بارے میں بھی ایک بڑا لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ وہ علامہ پرویز صاحب" کے حوالے سے یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "اسلام صرف یہ ہے کہ جس چیز میں خیر کا پہلو ہو وہ لے لو اور جو شر کا پہلو ہو وہ چھوڑ دو اور فی نفسہٖ اپنی ذات سے کوئی بھی چیز، کوئی بھی فن، کوئی بھی صنعت، کوئی بھی شوق نہ خیر ہے نہ شر... فنونِ لطیفہ کا کوئی سا بھی شعبہ چاہے وہ تصویر کشی ہو یا مجسّمہ سازی، رقص ہو یا موسیقی، نہ فی نفسہٖ بُرا ہے اور نہ ہرگز اسلام نے ان کو حرام یا ممنوع قرار دیا ہے، کیونکہ ان کا تعلق فطرتِ انسانی اور تمدنی زندگی سے ایسا گہرا ہے کہ اسے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔" شیکسپیئر نے شاعرانہ ترنگ میں آکر یہ بات کہی تھی کہ کوئی چیز فی نفسہٖ نہ اچھی ہے نہ بُری بلکہ ہمارا احساس اسے ایسا بناتا ہے لیکن پالوی صاحب کا کمال دیکھیے کہ انہوں نے اس سے خیر و شر کے پیمانے متعین کرنے میں مدد لی ہے۔ اگر خیر و شر محض ہمارے اپنے داخلی احساسات کا عکس ہے تو پھر ان اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے جھگڑوں کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے بعد تو قرآن مجید کی طرف بھی رجوع کرنا سرا سر تکلف معلوم ہوتا ہے۔ اسلام بس اپنے "من" کی پیروی کا نام رہ جاتا ہے۔ اور اسی سے ہر فعل کے جواز کا

ختم ہی لیا جا سکتا ہے۔ غور کیجیے اس قسم کی نکتہ آفرینیاں ہمیں کس مقام تک لے جاتی ہیں۔ پالوی صاحب نے مجسّمے کو جائز قرار دینے کے لیے قرآن مجید سے جس طرح استدلال کیا ہے اُسے بھی ملاحظہ فرمائیں۔ وہ ص۱۲۶ پر آیت مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ نقل کرنے کے بعد ص۱۲۷ پر یوں رقمطراز ہیں:۔

"اب زیرِ بحث آیت کا ترجمہ اُردو میں سنیے: (۱) جو کچھ سلیمان چاہتے وہ جنات تیار کر دیتے، مثلاً قلعے اور مجسّمے۔۔۔ تماثیل کہتے ہیں تصویروں کو، یہ تانبے کی تھیں اور بقول قتادہ وہ مٹی اور شیشے کی تھیں" (تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ)

اب یہ عبارت ایسی ہے جس کے شروع میں یہ لکھا ہے کہ یہ آیت کا ترجمہ ہے اور آخر میں یہ لکھ دیا ہے کہ یہ تفسیر ابن کثیر کا ترجمہ ہے۔ اس تلبیس کا مقصود بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک قاری اگر اسے تفسیری عبارت خیال کرے گا تو دوسرا اسے آیتِ قرآنی کا ترجمہ سمجھ بیٹھے گا۔ قرآن مجید میں حضرت سلیمانؑ کیلیے جن تماثیل کے بنائے جانے کا ذکر ہے ان سے جابجا پالوی صاحب نے تصاویر، انسانی مجسّمے یا جانداروں کے مجسّمے مراد لیے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید میں ایسی کوئی تصریح موجود نہیں ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ تماثیل سے مراد بے جان اشیاء یا مناظر کی تصاویر نہ لی جائیں اور خواہ مخواہ انہیں جانداروں کے مجسّمے ہی سمجھا جائے۔ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ جانداروں ہی کے مجسّمے تھے تب بھی علمائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ زندگی کے جن معاملات کے بارے میں خدا کی آخری کتاب اور اس کے آخری رسولؐ کی سنت میں واضح احکام آ گئے ہیں ان معاملات میں سابق شرائع ہمارے لیے حجت نہیں ہیں، تصویر اور مجسّمے کے بارے میں چونکہ سنتِ محمدیہ میں صریح احکام موجود ہیں اس لیے اس معاملے میں سابق شریعت کے کسی مجمل اور ذو معنی جزیئے سے استناد کیسے صحیح قرار دیا جا سکتا ہے۔

پالوی صاحب مجسموں کے بارے میں اپنے اس غلط موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی تعلیمات ہمیشہ ایک ہی ہیں یعنی جو بھی پیغمبر آئے ان کی تعلیمات اصولی حیثیت سے ایک تھیں شریعت اللہ تعالیٰ مقرر کرتا ہے، پیغمبر نہیں۔"

لیکن ان کی یہ بات تب ہی صحیح مانی جا سکتی ہے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر

نبی پر نازل کردہ تعلیمات، کلیات اور جزئیات دونوں لحاظ سے عین بعین یکساں تھیں۔ لیکن یہ بات کسی طرح صحیح نہیں اور خود قرآن نے اس کی تردید کر دی ہے۔ قرآن مجید سابق کتب کی بعض آیات کے منسوخ کرنے اور ان کے مثل یا ان سے بہتر لانے کا اعلان کرتا ہے۔

اس معاملہ میں بھی لطف کی بات یہ ہے کہ پالوی صاحب نے اپنے اس پیش کردہ کلیے کے بارے میں بھی ایک جیسی روش اختیار نہیں کی۔ تصویر اور مجسمے کی بحث میں تو وہ شرائع کے جزوی اختلافات کو ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس کے مان لینے سے تماثیل کے متعلق ان کا استدلال غلط ہو جاتا ہے لیکن آگے "اکل و شرب" کی بحث میں دختِ رز کو حلال ٹھہرانے کے لیے وہ اسی حقیقت کو آگے بڑھ کر خود تسلیم کر لیتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"جس خدا نے اپنے کسی رسول کے ذریعے سے کسی چیز کو ان پر حرام کر دیا تھا اسی خدا نے اپنے دوسرے رسول حضرت عیسٰیؑ کی معرفت احکام بھیج کر ان پر بعض چیزیں حلال کر دی تھیں۔"

تصویر کشی اور بت گری کے بعد ایک باب انہوں نے رقص و موسیقی کے لیے بھی وقف کیا ہے اس میں وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا کی آیت نقل کر کے نیچے توراۃ کے حوالوں اور "علامہ عبدالحلیم شرر" کی تحریروں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ "حضرت داؤد علیہ السلام گانے بجانے کے رسیا تھے۔ انھوں نے مذہبی رسوم کے لیے موسیقی کی جوکیاں اور بینڈ مقرر کیے، عبادت کے وقت وہ خدا کے سامنے ناچتے اور گاتے"۔ ہمیں ان لوگوں کے اس طرزِ استدلال کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان لوگوں کے سامنے جب قولِ رسولؐ، صحابہؓ، تابعینؒ اور محدثینؒ کے مستند حوالوں سے پیش کیا جاتا ہے تو یہ بڑے ہی مغرورانہ انداز میں اُسے ٹھکراتے ہوئے کہتے ہیں "ہمارے سامنے قرآن سے سند لاؤ"۔ لیکن جب ان کی اپنی باری آتی ہے تو قرآنی آیات کی تشریح کی آڑ میں محرّف کتابوں اور تیسرے درجے کے عامیانہ مضمون نگاروں کے حوالوں پر اعتماد کرنے میں بھی قطعاً کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔

یوں تو یہ ساری کتاب ہی "لطائف" کا مجموعہ ہے لیکن شراب کے ضمن میں انہوں نے جو طرزِ استدلال اختیار کیا گیا ہے وہ تو انتہائی دلچسپ ہے۔ ص ۲۵۱ ، ۲۵۲ پر وہ فرماتے ہیں "جن چار چیزوں

کہ قرآن نے حرام کیا ہے اُن میں شراب کا کوئی ذکر نہیں" پھر کہتے ہیں " شراب کے لیے اصطلاحاً حرام کا لفظ بولا جا سکتا ہے اگرچہ اس کا ذکر حرام چیزوں میں نہیں اور ہر چند شراب کے فائدوں سے بھی قرآن کو انکار نہیں" پھر کہتے ہیں " ایک مسلمان کا قطعی طور پر شراب سے پرہیز کرنا لازم ہے، مگر عجیب بات ہے کہ شراب کی حرمت میں غلو سے کام لیا گیا ہے اور غلو بجائے خود ممنوع ہے اور غلو یہ ہے کہ شراب ہی کو نہیں بلکہ نشہ کو حرام بتایا گیا ہے۔" ان ساری نکتہ آفرینیوں کے بعد پالوی صاحب شراب کے نشے اور افیون، بھنگ وغیرہ کے نشے میں ایک باریک مگر انوکھا فرق بیان فرماتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ " شراب کے نشے میں انسان اوندھے منہ یعنی منہ کے بل گرتا ہے، دوسرے نشے میں یہ بات نہیں۔ آج تک کسی شرابی کو کروٹ کے بل یا چت گرتے نہیں دیکھا گیا۔ اسی طرح دوسری نشے والی چیزیں پینے والے کو منہ کے بل گرتے نہیں دیکھا گیا۔" اب منہ کے بل گرنے سے اور چت گرنے سے حلّت و حرمت کے احکام میں جو فرق پیدا ہوتا ہوگا اسے پالوی صاحب نے صیغۂ راز ہی میں رکھا ہے۔ وہ غالباً یہ چاہتے ہیں کہ قارئین خود اس کا منشا اور مدعا سمجھیں اور تجربہ سے اس نکتے کی باریکیاں سمجھنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ اسلام تجربہ اور مشاہدہ کا دین ہے" اس لیے جس نشے سے وہ اوندھے منہ گریں اس سے تو پرہیز کریں، لیکن جس نشے سے فقط چت گریں اُسے بغیر کسی مضائقہ کے استعمال میں لائیں۔ پوری کتاب اسی قسم کی لغویات سے بھری پڑی ہے اس کے پیش کردہ مواد، طرزِ استدلال اور اسلوبِ بیان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جسے کسی جہت سے بھی فائدہ مند کہا جا سکے۔ اس کے پڑھنے سے البتہ ایک فائدہ ضرور ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو شخص بھی یہ معلوم کرنا چاہے کہ انکارِ سنت سے آدمی کے دین اور اس کی عقل پر خدا کی کیسی پھٹکار پڑتی ہے وہ اس میں عبرت کے بہت سے پہلو تلاش کر سکتا ہے۔

مکتبہ جدید نے اسے شائع کرکے دنیا اور آخرت دونوں کے اعتبار سے سخت ٹوٹے کا سودا کیا ہے۔ کاروباری مصلحتیں اپنی جگہ پر درست ہی سہی لیکن ان کے زیرِ اثر آدمی اتنا بے حس تو نہ ہو جانا چاہیے کہ وہ صریح منکرات کے پھیلانے کا ذریعہ بن جائے۔